اسلام میں اختلاف کے آداب

(۲)

اختلاف کی تاریخ

ترجمہ و تلخیص: جناب عبدالحی ابڑو - استاد شعبہ شریعہ و قانون

اسلامی یونیورسٹی - اسلام آباد -

عہدِ نبویؐ میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف مذکورہ بالا مفہوم کے لحاظ سے عہدِ نبویؐ میں اختلاف کے پائے جانے کی کوئی وجہ موجود نہیں تھی - اس لیے کہ حضورؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سب کے لیے مرجع تھی - وہ تمام معاملات آپ کے سامنے رکھتے اور ان کے بارے میں رہنمائی حاصل کرتے اور حضورؐ راہِ حق و ہدایت کی نشان دہی فرما دیتے تھے - لیکن جو لوگ مدینہ منورہ سے دور ہوتے، چونکہ ان کے لیے حضورؐ کی طرف رجوع کرنا مشکل تھا اس لیے ان کے درمیان اختلاف واقع ہونا ایک قدرتی امر تھا - خاص طور پر کتاب اللہ یا سنّتِ رسول کی تفسیر اور پیش آمدہ واقعات پر انہیں منطبق کرنے کی صورت میں یا کبھی کسی مسئلے کے بارے میں کوئی صریح نص نہ پانے کی صورت میں وہ اجتہاد کرتے - ان کا اجتہاد ایک دوسرے سے تھوڑا بہت مختلف ہوتا - ایسے لوگ جب مدینہ واپس آتے تو نصوص سے اپنی فہم کے مطابق حاصل کردہ مفہوم یا اجتہادی مسائل حضورؐ کے علم میں لاتے - تب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم یا تو انہیں درست قرار دیتے جو سنّت کا حصہ بن جاتا، یا درست مسئلہ بیان فرما دیتے جس پر وہ مطمئن ہو جاتے اور اسے اخذ کر لیتے - اس طرح اختلاف ختم ہو جاتا - اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱ --- بخاری اور مسلم کی روایت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جنگِ احزاب کے دن

فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص بھی بنو قریظہ کی آبادی تک پہنچنے سے پہلے نمازِ عصر نہ پڑھے"۔ کچھ لوگوں کو عصر کا وقت راستے میں پیش آ گیا۔ (ان میں سے) بعض نے کہا "ہم بنو قریظہ کے گھروں تک پہنچنے سے پہلے نماز نہیں پڑھیں گے"۔ جب کہ بعض دوسرے حضرات نے کہا "ہم تو نماز پڑھیں گے حضورؐ کا منشا یہ نہیں تھا"۔ یہ بات "(واپسی میں) حضورؐ کے علم میں لائی گئی، تو آپ نے کسی کو سرزنش نہیں فرمائی۔

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ نمازِ عصر کی ادائیگی کے سلسلے میں صحابہ آپس میں دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ نے (منطق کی اصطلاح کے مطابق) ظاہر اللفظ یا (حنفی اصولیہ کی اصطلاح کے مطابق) "عبارۃ النص" پر عمل کیا، جبکہ دوسرے گروہ نے نص سے ایک معنی اخذ کر کے اس کے ساتھ اس کی تخصیص کر دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دونوں کے طرزِ عمل کو درست قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں گروہ حق پر تھے۔

اس سے ثابت ہوا کہ مسلمان کو کسی نص کے ظاہری معنی لینے کا بھی حق حاصل ہے اور اسی طرح اس سے ایسے دوسرے معانی اخذ کرنے کا بھی جن کا احتمال اس کے اندر موجود ہو، اور اس کے لیے دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہو۔ جب وہ ایسی کوشش کا اہل ہو تو اس کا یہ عمل قابلِ گرفت نہیں ہوگا[1]۔ صحابہؓ کے دوسرے گروہ نے اس ارشاد سے یہ سمجھا کہ حضورؐ چاہتے تھے کہ جانے میں بہت تیزی سے کام لیا جائے۔ اس لیے انھوں نے یہ سوچا کہ بنو قریظہ کے ہاں پہنچنے سے پہلے نماز کی ادائیگی حضورؐ کے ارشاد کے مطابق منافی نہیں، جب کہ نماز ادا کرنے کی صورت میں ان کے وہاں پہنچنے میں تاخیر بھی نہ ہوگی۔ یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ علامہ ابنِ قیمؒ نے اعلام الموقعین میں ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک کے مسلک کی درستگی کے بارے فقہا کے اختلاف کا ذکر

[1] بشرطیکہ کوئی اجتہادی رائے دوسرے کسی اُصولِ منصوص و مسنون اور مجموعی ہیئتِ دین و مقاصدِ دین یا اسلام کے نظامِ عقائد، نظامِ اخلاق، نظامِ قانون اور نظامِ سیاست و معیشت کے خلاف نہ ہو اور مصلحتِ امن اور مفادِ مسلمین سے بھی نہ ٹکرائے۔ (ایڈیٹر)

کرتے ہوئے کہا ہے: "کچھ فقہاء کے قول کے مطابق راستے میں نماز ادا کرنے والوں کا عمل افضل ہے اس لیے کہ انہوں نے نماز اپنے وقت میں ادا کرنے اور حضورؐ کے حکم کی پیروی کرنے کی دونوں فضیلتیں حاصل کر لیں، جب کہ کچھ دیگر فقہاء کے نزدیک بنو قریظہ کے ہاں پہنچنے تک نماز کو مؤخر کرنے والوں کا عمل افضل ہے....." یعنی فرق غلط اور صحیح کا نہیں بلکہ افضل اور غیر افضل کا ہے۔

ہمارے خیال کے مطابق جب کہ حضورؐ نے کسی فریق کو سرزنش نہیں کی، تو فقہاء رحمہم اللہ کو چاہیے تھا کہ وہ اسی پہ اکتفا کرتے، اور ایسی چیز کے بارے میں بحث مباحثے سے پرہیز کرتے، جس کا فیصلہ خود حضورؐ نے فرما دیا تھا۔

۲۔ اس کی دوسری مثال وہ حدیث ہے جسے ابوداؤد اور حاکم نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "غزوہ ذات السلاسل کے دوران جاڑے کی ایک رات میں مجھے احتلام ہوگیا، مجھے خدشہ ہوا کہ اگر میں نے غسل کیا تو کہیں میری موت واقع نہ ہو جائے، اس لیے میں نے تیمم کیا اور اپنے ساتھیوں کی نماز فجر میں امامت کی، انہوں نے حضورؐ سے اس واقعے کا ذکر کر دیا۔ حضورؐ نے پوچھا: "اے عمرو! تو نے احتلام کی حالت میں امامت کی؟ میں نے اپنے غسل نہ کر سکنے کی وجہ بھی حضورؐ کے سامنے بیان کر دی اور یہ آیت پڑھی: وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (النساء-۲۹) "اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، بلاشبہ اللہ تمہارے اوپر مہربان ہے۔" اس پر حضورؐ مسکرا دیے اور کچھ نہیں کہا۔ گویا مذکورہ عذر کے ساتھ تیمم کرنے اور تیمم کے ساتھ جماعت کرا دینے کے فعل کو سند مل گئی۔

تاویل اور اس کی قسمیں عہدِ نبویؐ اور اس کے بعد صحابہؓ میں واقع ہونے والے سارے اختلافات کا بیان یہاں مقصود نہیں۔ بسا اوقات کچھ صحابہؓ نے الفاظِ عبارت کے بالکل ظاہری معنی مراد لیے اور کچھ نے اس سلسلہ کلام یا محاورہ روزمرہ یا شریعت کی مجموعی فضا کے لحاظ سے معانی استنباط کیے۔ یہ ایک لمبی بحث ہے جس کے لیے کئی جلدیں درکار ہوں گی۔ یہ مختصر سا مقالہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ بہرحال صحابہؓ نے ان واقعات سے یہ بات ذہن نشین کر لی تھی کہ دین میں آسانی رکھی گئی ہے اور شریعت میں کسی نص سے حکم کے استنباط کرنے کے لیے اختلاف رائے کی گنجائش موجود ہے۔

اب یہ ماہر مجتہدین اور فقہاء کا کام ہے کہ شریعت کے کلیات و قواعد اور اس کے مقاصد تک پہنچانے والے احکام بیان کریں۔ یہ مقصد کبھی ظاہرِ لفظ کو جوں کا توں لینے سے حاصل ہوتا ہے اور کبھی اس ظاہر لفظ کے پیچھے پوشیدہ معنی کے استنباط سے، جسے "تاویل" کا نام دیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر روشنی ڈالنا فائدے سے خالی نہ ہوگا، لہٰذا ذیل میں تاویل کی اقسام اور اس کے قواعد و ضوابط کو اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

۱- قریبی تاویل | جسے معمولی غور و فکر سے معلوم کیا جا سکتا ہو اور وہ عبارت اس کا احتمال بھی رکھتی ہو، جیسے یتیم کا مال بطور صدقہ دینے، یا کسی اور کو بلا عوض دینے، یا اسے ضائع کرنے کو آگ کھانے کے مترادف قرار دے کر اسے اس قرآنی آیت کی رُو سے حرام ٹھیرایا جائے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ...... (النساء-۱۰) "جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں۔ درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے"۔

دوسری مثال- کسی برتن میں پیشاب کر کے اسے ٹھیرے ہوئے پانی میں ڈال دینے کو ایسے پانی میں براہِ راست پیشاب کرنے کے مترادف قرار دے کر اس حدیث کا مصداق ٹھیرانا جس میں ایسا کرنے سے ممانعت وارد ہوئی ہے، حضورؐ کا ارشاد ہے: "تم میں سے کوئی شخص ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرے جس سے اُس نے بعد میں نہانا ہے"۔ اس لیے کہ دونوں فعل پانی کی گندگی کا سبب بنتے ہیں۔

۲- دُور کی تاویل | جسے معلوم کرنے اور اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے زیادہ غور و فکر درکار ہو اور لفظ اس کا احتمال بھی رکھتا ہو۔ جیسے حضرت ابن عباسؓ نے حمل کی کم از کم مدت مندرجہ ذیل قرآنی آیات سے چھ مہینے اخذ کی:

وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (الاحقاف: ۱۵) "اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے"۔ اور دوسری آیت میں ہے:

وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ - (البقرہ: ۲۳۳) "جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدتِ رضاعت تک

دودھ پیے تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں"۔ (دو سال مدت رضاعت اور کم از کم چھ مہینے مدتِ حمل)۔

یا جیسا کہ امام شافعیؒ نے اجماع کی حجیت پر اس قرآنی آیت سے استدلال فرمایا:

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا۔ (النساء-۱۱۵) "جو شخص رسولؐ کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہلِ ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے، درآں حالیکہ اس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہو، تو ہم اس کو اسی طرف چلائیں گے، جدھر وہ خود پھر گیا۔ اور اسے جہنّم میں جھونک دیں گے۔ جو بدترین جائے قرار ہے"۔

اسی طرح اصولیوں نے قرآنی آیت فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ۔ (الحشر-۲) "پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو" سے قیاس کی حجت اور اس کے شرعی دلیل ہونے پر استدلال کیا ہے۔ اس طرح کے نتائج اخذ کرنا اگرچہ بظاہر آسان نظر آرہا ہے۔ مگر ان تک رسائی اس وقت تک مشکل ہے جب تک انسان کی سوچ وسیع اور نظر گہری نہ ہو، پھر اس کے لیے غور و فکر اور تدبر کے ملکہ کی بھی ضرورت ہے جو عام لوگوں کو حاصل نہیں ہوتا۔

۳- دور از کار تاویل | جس کا احتمال لفظ کے اندر موجود نہ ہو، اور تاویل کنندہ کے پاس کسی قسم کی کوئی دلیل بھی نہ ہو، جیسے کسی نے اس آیت: وَعَلَامَاتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ (النحل-۱۶) "اس نے زمین میں راستہ بتلانے والی علامتیں رکھ دیں، اور تاروں سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں" کی تفسیر یہ بیان کی ہے کہ "نجم" رسول اللہ ہے اور "علامات" امام ہیں۔ یا جیسے کسی نے اس آیت: وَمَا تُغْنِي الْآيَاتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَا يُؤْمِنُونَ۔ (یونس-۱۰۱) "اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہو سکتی ہیں؟" سے یہ مفہوم نکالا ہے کہ "آیات" سے مراد امام ہیں اور "نذر" سے انبیاء۔ اسی طرح کچھ حضرات نے عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ (النبا-۱-۲) "یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ کیا اس بڑی چیز کے بارے میں....." "نباءِ عظیم" سے مراد

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات لی ہے[۱]۔

تاویل کے قواعد و ضوابط اب تک جو بات ہوئی ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تاویل کے لیے غور و فکر کے علاوہ کسی دلیل (یا احتمال) اور ضرورت کی موجودگی بھی ضروری ہے بصورتِ دیگر نصوص کے ظاہری معنی کو اخذ کر لینا محفوظ طریقہ ہے۔ تاویل کی طرف صرف اجتہادی امور کی صورت میں رجوع کیا جائے۔ رہے اعتقادی مسائل تو ان میں اجتہاد کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں، ان میں نصوص کے ظاہری معنی لینا اور حقیقت میں مراد لیے گئے معانی اور کیفیات کو خدا کے سپرد کر دینا خالی از خطر راستہ ہے اور سلف صالحین کا بھی یہی موقف رہا ہے۔

تاویل ناگزیر ہو جانے کی صورت میں نص کو سمجھنا، اس کا تجزیہ کرنا، اور لغوی لحاظ سے ساری وجوہ کا احاطہ کرنا ضروری ہے (جو مقاصدِ شریعت اور عام شرعی کلیات اور قواعد کے مطابق بھی ہوں) اسی لیے کسی مسئلے میں نص کے ظاہری معنی کے مطابق حکم بیان کرنا یا دلالت کی مختلف وجوہ معلوم کرنے کے لیے نص کا تجزیہ کرنا فقہی اجتہاد اور شرعی اعتبار و قیاس کی ایک اہم قسم ہے، جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ (الحشر ۲) "پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو!"

حضرت ابنِ عباسؓ نے تفسیر کے قواعد و ضوابط بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ تفسیر کی چار اقسام ہیں:

۱- ایک قسم ایسی ہے جو عربوں کے ہاں ان کے کلام میں معروف ہے۔

۲- دوسری قسم وہ ہے جس کے نہ جاننے میں کسی کا عذر قابلِ قبول نہیں ہے (یعنی جو ہر ایک کو معلوم ہونی چاہیے)

۳- تیسری قسم جسے صرف علماء جانتے ہیں۔

۴- چوتھی قسم جسے صرف اللہ جانتا ہے۔

اس بنا پر تاویل اور تفسیر کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ شارع نے کئی مقامات پر ان میں سے

---

[۱] اصول الکافی ۱/۲۱۴

ایک کو دوسرے کی جگہ استعمال کیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ (آل عمران ۳:۷) "ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ان پر ایمان ہے"۔

مفسرین کی اکثریت نے یہاں "تاویل" سے تفسیر اور بیان کو مراد لیا ہے۔ امام طبریؒ بھی ان میں شامل ہیں، جنھوں نے حضرت ابن عباسؓ اور دیگر حضرات سے اس کے یہی معنی نقل کیے ہیں۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباسؓ کے لیے جو دعا فرمائی اس میں فرمایا: اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاْوِيْلَ (اے اللہ! اسے دین کی سمجھ اور قرآن کی تفسیر کا علم عطا فرما)۔ یہاں بھی تاویل کا لفظ تفسیر اور بیان کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

کچھ علما نے تفسیر کو "تاویل" کے مقابلے میں زیادہ "عام" شمار کیا ہے۔ جیساکہ "المفردات" کے مصنف علامہ راغب اصفہانی کا خیال ہے۔ انھوں نے کہا کہ تفسیر کا لفظ زیادہ تر الفاظ کے بیان اور شرح کے لیے استعمال ہوتا ہے جب کہ تاویل زیادہ تر معانی اور جملوں کے بیان کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تاویل کا اطلاق عام طور پر کتاب وسنّت کی نصوص سے معانی کے استنباط پر ہوتا ہے، جب کہ تفسیر کا لفظ کتاب وسنّت میں سے کسی بھی نص سے معانی کے استنباط پر بولا جاتا ہے۔

کتاب اللہ اور سنّت رسول میں استعمال کے لحاظ سے ان دونوں اصطلاحات کے درمیان پائے جانے والے گہرے تعلق کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "تاویل" کے قواعد وضوابط بھی وہی ہیں جو ماہرین فن نے تفسیر کے لیے مقرر کیے ہیں۔

اس بات میں شبہہ کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے کہ کتاب اللہ میں چند ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے جیسے اسما اور صفات خداوندی کی صحیح پہچان کا علم، اور اُمور غیبیہ کی تفصیلات وغیرہ۔ اسی طرح کچھ ایسے اُمور بھی ہیں جن کا صرف نبیؐ کو علم دیا گیا ہے

اور کوئی شخص ایسی چیزوں کی تفسیر یا تاویل بیان کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ ہر شخص پر فرض ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کی حدود کا پابند رہے اور ان سے تجاوز نہ کرے۔

اِن دو اقسام کے علاوہ ایک تیسری قسم بھی ہے، اور یہ ایسے علوم ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو تعلیم دی، جو قرآن میں موجود ہیں۔ اور حضورؐ کو حکم دیا کہ لوگوں کو ایسے علوم سکھائیں۔ اور انہیں بیان کریں۔ ایسے علوم کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ وہ اُمور جن میں بحث و تمحیص کی گنجایش نہ ہو، بلکہ صرف منقول چیزوں پر اکتفا کیا جائے۔ جیسے قرآن کے اسبابِ نزول اور ناسخ و منسوخ وغیرہ۔

۲۔ ایسے اُمور جو استدلال اور غور و فکر کے ذریعے معلوم کیے جائیں۔ ان کے بارے میں بھی علمائے حق کے دو موقف ہیں:

ا۔ ان اُمور کی پہلی قسم وہ ہے جس کی تاویل کے جواز یا عدم جواز کے بارے میں ان کا آپس میں اختلاف ہے۔ جیسے اسماء اور صفاتِ خداوندی سے متعلق آیات۔ اس کے بارے میں سلف کا طریقہ یہ ہے کہ یہاں تاویل ناجائز ہے اور درست مذہب بھی یہی ہے۔

ب۔ دوسری قسم (جس کے جائز ہونے پر ان کا آپس میں اتفاق ہے) یہ ہے کہ تفصیلی دلائل سے شرعی احکام مستنبط کیے جائیں۔ اس کا نام "فقہ" ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ علماء نے تاویل اور تفسیر کی کچھ شرائط بھی مقرر کی ہیں، جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ تاویل، لغوی قواعد اور الفاظ کے استعمال میں عربوں کے عرفِ عام کی روشنی میں سمجھ میں آنے والے ظاہری معنی کو ختم نہ کر دے۔

۲۔ کسی صریح نصِ قرآنی کے خلاف نہ ہو۔

۳۔ علماء اور ائمہ کے درمیان کسی متفق علیہ شرعی قاعدہ کے خلاف نہ ہو۔

۴۔ سببِ نزول کے لحاظ سے نص جس مقصد کے لیے وارد ہوئی ہو، اس کا لحاظ رکھا جائے۔

جہاں تک باطل یا قابلِ ترک تاویل کی اقسام کا تعلق ہے تو انہیں مندرجہ ذیل چند اقسام

یں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ تاویل اور تفسیر کسی ایسے شخص سے صادر ہوئی ہوں جو ان کا اہل نہ ہو، جس کے پاس لغوی نحوی اور تاویل کے لیے ضروری دیگر شرائط کا خاطر خواہ علم نہ ہو۔

۲۔ متشابہات کی کسی صحیح سند کے بغیر تاویل۔

۳۔ ایسی تاویلات جو کتاب وسنت کے واضح معانی یا اجماعِ امت کے منافی باطل آرا کو درست ثابت کرتی ہوں۔

۴۔ تاویل کے ساتھ قطعیت سے (بغیر دلیل لائے) یہ کہنا کہ شارع کی یہی مراد ہے۔

۵۔ ایسی تاویل جس کی بنیاد خواہش نفس پر ہو، جیسے باطنیہ وغیرہ (فرقوں) کی تاویلات۔

یہ تمام قابلِ ردّ تاویلات "تاویل مستبعد" (دور از کار تاویل) کے زمرے میں آتی ہیں۔ جس کا ذکر ہم پہلے صفحات میں کر چکے ہیں۔ (باقی)

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورت استدلال کے لیے آیات واحادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات واحادیث ہوں، ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

(ادارہ)